مولانا عبدالسلام قدوائی

ہندوستانی رسائل سے انتخاب

رئیس احمد جعفری

تأثرات اور یادیں

موت کسی کی بھی دل کو غمگین اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتی ہے، پھر اس دوست کی موت پر کیا حال ہوگا ان دوستوں کا جن کی رعنائی خیال اسی کے تصور سے قائم تھی، جو زندگی کی ناگواریوں کو اس کی یاد سے گوارا بنائے ہوئے تھے اور دوری منزل کے باوجود کبھی مل سکنے کی امیدیں زندگی کے دن گذار رہے تھے۔ رئیس احمد جعفری میرے ایسے ہی دوست تھے، ۴۵ء میں ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلما میں پہلے پہل ان سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ ماحول سے آئے تھے۔ لیکن طبیعت ایسی ملی کہ یک جان دو قالب ہو گئے۔ دارالعلوم کی زندگی میں اور دارالعلوم کے بعد بھی ہم لوگوں کی دوستی ضرب المثل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ کبھی جدا نہ ہوں گے لیکن افسوس کہ تقسیم ملک کے بعد قسمت نے دو دوستوں کو سیکڑوں میل دور کر دیا، میں ہندوستان میں رہ گیا اور وہ پاکستان چلے گئے لیکن یہ بعد مکانی دل کی محبت میں حائل نہ ہو سکا۔ گذشتہ ۲۰ سال کی مدت میں دو تین بار سے زیادہ ملاقات نہ ہو سکی۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری نہ تھا کبھی کوئی خط آجاتا لیکن دل کی دنیا ان کی یاد سے کبھی خالی نہیں رہی، وہ جب ہندوستان آتے تو مجھ سے ضرور ملتے اور پاکستان آنے کی دعوت دیتے لیکن میں سفر میں ہمیشہ کچا ہوں، چند میل کا فاصلہ بھی ہفت خواں معلوم ہوتا ہے۔ پھر پاکستان کے دشوار سفر کی ہمت کہاں سے لاتا۔ ان کی پرخلوص اور محبت آمیز دعوت کا انکار تو نہ کر سکتا تھا مگر اس راہ میں قدم بڑھانے کا یارا بھی نہ ہوتا تھا۔ سفر تو بڑی بات ہے اس کی تمہیدی منزل بھی کبھی مجھ سے طے نہ ہو سکی اور شوق دید پر کوتاہ قدمی ہمیشہ غالب آتی رہتی لیکن بایں ہمہ ان کی ملاقات کی آرزو سے کبھی دل خالی

نہیں رہا اور پرانے دوست کو نئے ماحول میں دیکھنے کی تمنا قلب کو آمادۂ سفر کرتی رہی، افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے اس نخلِ آرزو کی جڑ کاٹ دی اور آس کو یاس سے بدل دیا لیکن اس مایوسی کے عالم میں بھی دل ان کی یاد سے خالی نہیں ہے بلکہ آج پہلے سے بھی زیادہ وہ یاد آرہے ہیں سید آلِ رضا لکھنوی کا یہ شعر کیسا حسبِ حال ہے ؎

نہ مل سکنے کا جن سے فیصلہ قسمت نے کر ڈالا وہی اس یاس کے عالم میں ہر دم یاد آتے ہیں

آج سوچتا ہوں ۴۵ برس کی طویل زندگی کیسی برق پا محسوس ہوتی ہے چشمِ تصور میں ہم لوگوں کا دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ ابھی تو کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۲۳ء کی گرمیوں میں ندوہ میں داخل ہوا تھا۔ رئیس مجھ سے کچھ پہلے آچکے تھے لیکن وہ بورڈنگ میں مقیم تھے اور میں شہر میں رہتا تھا اس لیے درجہ کی دید و شنید کے سوا ہم لوگوں کے درمیان زیادہ روابط نہ پیدا ہو سکے۔ ۱۹۲۵ء میں جب میں بھی بورڈنگ میں رہنے لگا تو ان سے شناسائی بڑھی۔ طلبہ کی انجمن الاصلاح سے انھیں بھی دلچسپی تھی اور مجھے بھی، دارالاخبار اور دارالکتب انجمن کے اہم شعبے تھے، ان ہی دریچوں سے نئی روشنی طلبہ کے دماغوں تک پہنچتی تھی۔ ہم لوگ یہیں ایک دوسرے سے ملتے کبھی اخبارات اور رسائل کی میز پر اور کبھی دارالکتب کی الماریوں کے قریب۔

رئیس صاحب خیرآباد جیسے مردم خیز قصبہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کے نانا نیاز احمد صاحب پولیس کی انسپکٹری کے باوجود اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے، آگرہ کی کوتوالی کے زمانہ میں دلگیر اکبرآبادی اور ان کے ادبی حلقہ سے خاص تعلق تھا۔ بڑے نانا حضرت ریاض امیر مینائی کے نامور شاگرد اور اردو کے مسلم الثبوت استاد تھے اور بجا طور پر کہا جاتا تھا ؎

ہندوستان میں دھوم ہے کس کی زبان کی وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

حضرت وسیم بھی قریبی عزیز تھے، مضطر خیرآبادی بھی دُور نہ تھے، ماں بھی اچھی شاعرہ تھیں۔ شعر و ادب کی اسی فضا میں رئیس نے آنکھیں کھولیں، ندوہ کی علمی و ادبی صحبتوں نے اس طبعی ذوق کو اور جلا دی۔ ندوہ آئے ہوئے ابھی دوسرا ہی سال تھا کہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے شروع کیے اور طلبہ کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ اس زمانہ میں تحریری استعداد کو ترقی دینے کے لیے ندوہ میں قلمی رسالوں کا بڑا رواج تھا، انجمن الاصلاح کے ماہنامہ

کے علاوہ چھوٹے بڑے بہت سے رسالے نکلتے تھے۔ رئیس صاحب نے بھی ایک ماہنامہ نکالنا شروع کیا، جس کا سلسلہ کئی برس جاری رہا، میرا پہلا مضمون صاحب سیف و قلم کے عنوان سے مولانا اسمٰعیل شہید کے متعلق انھیں کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہم لوگ انجمن الاصلاح کے رکن منتخب ہو گئے، اس زمانہ میں دارالعلوم میں ایک بڑے ہر دلعزیز استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی تھے جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے الفاظ میں ندوہ کے لعل شب چراغ تھے۔ دُبلے پتلے چھوٹے سے قد میں بلا کی کشش تھی۔ گہری علمیت، بے مثال ذہانت، غیر معمولی وسعتِ نظر اور بلندیٔ اخلاق کا عجیب و غریب مرقع تھے، مولانا شبلی کے فیضان اور مولانا ابوالکلام کی تربیت نے انھیں علم و خطابت کی ایسی جامعیت بخشی تھی جو مشکل ہی سے کہیں اور نظر آتی ہے۔ نگاہ ایسی کیمیا تاثیر تھی کہ جس پہ پڑ گئی کندن بن گیا۔ ان کی بدولت طلبہ کی علمی اور ذہنی سطح بہت بلند ہو گئی تھی، افسوس کہ مولانا جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ان کے فیضِ صحبت سے ہونہار طلبہ کی اچھی خاصی تعداد تیار ہو گئی تھی۔ ہم لوگ بھی مولانا مرحوم کے فیض سے مستفیض ہوئے، انجمن الاصلاح کی رکنیت اور عہدوں نے علمی و ادبی صلاحیتوں کے ساتھ زمانہ کے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کو بروئے کار لانے کا سلیقہ پیدا کیا۔ خلافت و کانگریس کی تحریکوں کو دیکھنے اور ان کے رہنماؤں سے ملنے اور ان کے خیالات کے سننے اور پڑھنے کا موقع بھی ہم لوگوں کو ندوہ ہی کی طالب علمی کے دور میں کافی مل گیا تھا، اتحاد و اتفاق کی روح پرور جھلک بھی دیکھنے کو مل گئی تھی اور تفریق و انتشار کا دور بھی سامنے گذر رہا تھا، ان مشاہدات کی وجہ سے سطح کے نیچے کی سیاسی کیفیت سے کچھ آگاہی ہو گئی تھی۔

مولانا آزاد کے الہلال کی جلدیں تفصیل سے پڑھی تھیں اور ہمدرد کے مضامین بھی پڑھتے تھے۔ اس لیے نصب خلافت و امامت کا خیال دماغ میں جاگزین ہو گیا تھا۔ ندوہ کی دین و دنیا کی جامعیت کا تصور بھی دل کو بہت بھایا۔ بالآخر مولانا آزاد کی حزب اللہ کی طرز کی ایک جماعت بنانے کا خیال ہوا اور ندوہ کو اس کے اعلیٰ مطمح نظر تک پہنچانے کا شدید جذبہ پیدا۔ رئیس مرحوم اس اسکیم میں میرے دستِ راست تھے۔ طالب علمی کی زندگی بھی کیسی پُر جوش اور ولولہ انگیز ہوتی ہے محب اللہ لاری، نور اللہ مونگیری، عبدالمجیب سہالوی، نجم الدین قدوائی، ابراہیم عمادی، ابوالحسن علی

مسعود عالم ندوی، منت اللہ رحمانی، مصطفےٰ کریم دسنوی، محمد حنیف گجرانوالی، محمد ناظم بہاری حامد لکھنوی، محمد اکبر بلاسپوری، نیاز احمد بندولی، عبدالمجید اعظمی کیسے کیسے ذہین طلبہ اس جماعت میں شریک تھے۔ اس کے پُرخلوص جلسے آج بھی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں تو عجیب حال ہوتا ہے لیکن طالب علمی کی آرزوؤں کو زمانہ بروئے کار آنے کا موقع کہاں دیتا ہے ورنہ دل یہ کہتا ہے کہ اگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا ہوتا تو فلاحِ ملت کی راہ کتنی طے پا جاتی، غالباً مارچ ۱۹۳۰ میں ہم لوگوں نے یہ خیال مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا نے کچھ مشورے دیے اور مختصر پیمانہ پر آغازِ کار کی تدبیر بتائی۔ لیکن اچانک ایک معمولی سے واقعہ نے دارالعلوم میں ایک زبردست اسٹرائیک کی صورت اختیار کی، کچھ احباب تعلیم مکمل کرکے پہلے جا چکے تھے۔ اب باقی چند دوست اسٹرائیک کی زد میں آگئے اور تعمیر ملی کی آرزو دل کی دل ہی رہ گئی۔

دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں مولانا عبدالرحمٰن کے علاوہ مولانا شبلی کی شفقت و جانفشانی اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی علمی قابلیت اور خلوص و سادگی سے ہم لوگ بے حد متاثر ہوئے مولانا حیدر حسن خاں صاحب رئیس صاحب کے ساتھ بہت شفقت کرتے تھے۔ حدیث شریف کی تعلیم تمام تر انھیں کی مرہونِ منت ہے، بعد کو ان سے ارادت کا تعلق بھی قائم کرلیا اور اپنے ساتھ مجھے اس سعادت میں شریک کرلیا۔

ندوہ سے علیحدہ ہونے کے بعد ہم لوگوں نے جامعہ ملیہ میں داخلہ کی کوشش کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس زمانے میں شیخ الجامعہ تھے۔ ان کی خدمت میں درخواست بھیجی گئی، مولانا سید سلیمان صاحب مرحوم نے سفارشی خط لکھا اور ہم لوگ جامعہ کے طالب علم بن گئے ندوہ سے ہم لوگ ذہنی طور پر اتنے وابستہ تھے کہ بہت دنوں تک جامعہ میں جی نہ لگا۔ آج بھی یاد آتا ہے کہ گلشن منزل (جامعہ کالج دارالاقامہ) قرول باغ میں رئیس صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ندوہ کو بے قراری سے یاد کر رہے ہیں، جب کبھی کوئی جلسہ ہوتا یا احباب جامعہ کی محفل برپا ہوتی تو رئیس یہ کہے بغیر نہ رہتے کہ:

ہم کو تو وہ اپنا رنگ محفل یاد آتا ہے

اس پریشانی کے ساتھ ملیریا نے آگھیرا اور ایسے سخت بیمار ہوئے کہ زندگی کے لالے پڑ

گئے، گھبرا کے گھر گئے، وہاں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم کی توجہ سے اللہ تعالیٰ نے حیاتِ نو عطا فرمائی اس کے بعد پھر جامعہ آئے اور تین چار سال اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔

جامعہ کی زندگی میں ڈاکٹر ذاکر صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب، پروفیسر کیلاٹ صاحب اور مولانا اسلم صاحب سے خاص متاثر ہوئے۔ مولانا اسلم کے مذہبی خیالات کے سخت مخالف تھے، ان کی تردید میں کئی مضامین لکھے لیکن ان کی سادگی، شفقت، بزرگانہ عنایت اور بے نفسی سے بہت متاثر تھے اور جامعہ سے جانے کے بعد بھی مولانا سے نیازمندانہ تعلق قائم رہا، فارسی انھیں سے پڑھی تھی اور اُن کے مختصر مگر دل نشین طرزِ تعلیم کا ہمیشہ ذکر کرتے رہے۔

رئیس صاحب نے جامعہ آنے سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا جس میں انھوں نے دیکھا تھا کہ ایک اچھی سی جگہ ہے۔ نہرو رپورٹ جیسی کوئی کتاب رکھی ہے۔ اس زینہ نما جگہ پر قدم رکھا اور باہر ایک وسیع دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ خواب رئیس صاحب کے لیے عین حقیقت بن گیا، واقعی جامعہ کے ذریعہ انھیں شہرت و عزت کا وسیع میدان ملا، میری تعبیر میں تو نہرو رپورٹ جیسی کتاب سیرت محمد علی ہے جو ان کی آیندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مرحوم حامد علی خاں صاحب مینجر مکتبہ جامعہ کے دل میں سیرت محمد علی لکھوانے کا خیال آیا اور شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے رئیس صاحب کی جانب اشارہ کیا اور کام شروع ہو گیا۔ رئیس صاحب کی یہ پہلی تصنیف ہے ظاہر ہے کہ ایک طالب علم جس نے مولانا محمد علی کو دور سے دیکھا اور اخبار میں پڑھا ہو علم و تحقیق کا شاہ کار تیار نہیں کر سکتا تھا مگر پھر بھی مولانا محمد علی کی زندگی کے تمام پہلو اس کتاب میں آگئے اور آج تک کسی کو مولانا کی اس سے بہتر سوانح حیات لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

جامعہ میں چار برس بڑی دلچسپی سے گذرے، اساتذہ کی شفقت، کارکنوں کی دلنوازی اور فضا کی جاذبیت کے ساتھ مخلص دوستوں کا بھی ایک اچھا حلقہ ملا۔ اسمٰعیل محمد مدھا، محمد طیب، برکت علی فراق، محمد حسین، خلیل شرف الدین، خلیل جامعی، بدرالحسن مرحوم، امتیاز مرحوم اور یوسف مرحوم کے ایسے مخلص دوست اگر جامعہ نہ آتے تو کہاں ملتے۔ علم و نظر کی نئی راہیں جامعہ ہی کی بدولت نظر آئیں۔ یہیں کی ہمت افزائیوں نے ایک طائرِ شکستہ کو نئے

بال و پر عطا کیے اور آسماں پیمائیوں کا حوصلہ بخشا۔ جامعہ میں ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں آنے کے دوسرے ہی سال وہ کالج کی انجمن اتحاد کے صدر منتخب ہوئے، ناظم کی حیثیت سے مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا دور کافی کامیاب رہا، ان کے پُر زور خطبۂ صدارت اور اس سے زیادہ مدلل سالانہ رپورٹ کا بہت دن چرچا رہا۔ آج بھی جامعہ کی تاریخ (جامعہ کی کہانی) میں ان کی کامیابی کی روداد پڑھی جا سکتی ہے۔

سیرت محمد علی نے ان کی شہرت باہر پہنچائی اور مولانا شوکت علی نے اخبار خلافت کی ادارت کے لیے انھیں منتخب کیا۔ ذاکر صاحب کی رائے تھی کہ ابھی جامعہ میں کچھ عرصہ اور رہ کر مزید صلاحیت پیدا کریں، مگر خانگی پریشانیوں نے ملازمت پر مجبور کیا اور وہ دہلی سے بمبئی چلے گئے اور خلافت کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اخبار خلافت میں مجھے ان کے ساتھ کچھ عرصہ تک کام کرنے کا موقع ملا ہے، انھیں اخبار نویسی کا یہ پہلا تجربہ تھا مگر اس قابلیت اور سلیقہ کے ساتھ اخبار مرتب ہوتا تھا کہ جلد ہی یہ اردو کا ممتاز اخبار سمجھا جانے لگا۔

خلافت کی ادارت کے زمانہ میں انھوں نے اپنی آزادی پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے آپ ان کی جرأت اور قوتِ ایمانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں خلافت کے ورکنگ سکریٹری غازی محی الدین اجمیری تھے، غازی صاحب ادارتی عملہ کے بھی نگران تھے، ایک دن رئیس صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور ان کی ترجمہ کردہ ایک خبر دیکھنے لگے، اس خبر پر تین سُرخیاں دی گئی تھیں، غازی صاحب کو خیال ہوا کہ ترجمہ کم کرنے کی غرض سے زیادہ سرخیاں دی گئی ہیں۔ کہنے لگے، جعفری صاحب، اس میں تو دو سرخیاں اچھی رہیں گی۔ رئیس صاحب نے کہا: نہیں غازی صاحب، خبر کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ تین سرخیاں دی جائیں، غازی صاحب نے کہا کہ نہیں دو ہی ٹھیک ہیں اور پنسل سے ایک سرخی کاٹ دی، رئیس صاحب نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور ایک سُرخی اور بڑھا دی، اور کہا غازی صاحب، اب چار سرخیاں ہوں گی، ترجمہ میں نے کیا ہے، میں ہی سرخیوں کا فیصلہ کروں گا۔ آپ ترجمہ کیجیے گا، تو ایک ہی سرخی دیجیے گا، یہ جواب غازی صاحب نے پہلے کسی ایڈیٹر سے نہیں سنا تھا، گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

اور میرے کمرہ میں آئے، واقعہ سنایا اور کہنے لگے، دیکھو جعفری صاحب میرے ساتھ کیسا برتاؤ کر رہے ہیں، آپ انھیں سمجھائیے کہ یہ روش ٹھیک نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اب ملازمت کی خیر نہیں ہے، دوڑ کر رئیس صاحب کے پاس گیا اور روزگار کی قلت کا ذکر کر کے آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے باز آجائیں۔ لیکن اس بندۂ مومن نے جو جواب دیا وہ آج تک لوحِ دل پہ نقش ہے، کہنے لگے "عبدالسلام، سُن، جب تک رہیں گے، عزت کے ساتھ رہیں گے رزق غازی کے ہاتھ میں نہیں ہے خدا کے ہاتھ میں ہے۔" اس مردِ قلندر سے یہ ایمان آفرین جواب سُن کر میں دنگ رہ گیا۔ زندگی کے آئندہ واقعات نے بتایا کہ ان کی روش صحیح تھی اور خدا نے انھیں عزت کے ساتھ دیا اور بہت کچھ دیا۔ حدیث قدسی انا عند ظن عبدی (میرا بندہ میرے ساتھ جو حُسن ظن رکھتا ہے میں اس کے ساتھ رہتا ہوں) بارہا پڑھی تھی مگر رئیس کی زندگی میں اس کا عملی اثر دیکھا۔ عقاید میں بہت مضبوط تھے۔ عمل میں چاہے کوتاہی ہو جائے مگر ایمان کی پختگی میں کبھی کوتاہی نہیں آئی۔ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، خدا کی رحمت پر بے حد بھروسہ تھا، میں کبھی کسی عملی کوتاہی پر سرزنش کرتا تو کہنے لگتے "خدایا، یہ عبدالسلام مجھے ڈراتا ہے لیکن مجھے تیری رحمت و مغفرت پر بڑا بھروسہ ہے۔" کیا عجب ہے کہ جس طرح زندگی میں اللہ نے ان کے حسنِ ظن کا توقع سے بڑھ کر صلہ دیا اسی طرح آخرت میں بھی اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔

بمبئی میں پندرہ سولہ مہینے میں ان کے ساتھ رہا، اس اثنا میں انھوں نے مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کا ماتحت ہوں۔ ہمیشہ محبت و مساوات کا برتاؤ کرتے رہے۔ خلافت سے پھر میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں مدرس ہو کر لکھنؤ چلا آیا لیکن ان کی دوستانہ عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا، وہ میرے ندوہ آنے کو پسند نہیں کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ میں طالب علمی کے دور کے منصوبوں کو اس ملازمت میں پورا نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا اور کئی برس کی جد و جہد کے بعد مجھے ناکامی کا اعتراف کر کے ندوہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔

مولانا شوکت علی صاحب کے انتقال کے بعد خلافت سے الگ ہو کر انھوں نے اپنا ایک اخبار نکالا۔ وہ ذہنی طور پر مولانا محمد علی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا شوکت علی کی صحبت میں یہ

اثر اور بڑھا۔ نہرو رپورٹ کے بعد ہی سے وہ کانگریس سے بدظن ہو گئے۔ اس بدظنی میں برابر اضافہ ہوتا رہا، اور بڑی بے باکی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد حالات نے ان کی تلخی میں اور اضافہ کیا اور انھیں مجبوراً پاکستان جانا پڑا۔ پاکستان میں ان کے قدردان موجود تھے، کچھ عرصہ تک اپنا اخبار نکالا۔ ریاض کے نام سے ایک ماہنامہ بھی عرصہ تک نکالتے رہے، پھر ثقافت لاہور کے حلقۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ پاکستان میں تقریباً بیس سال انھوں نے گذارے اور بے شمار مضامین و مقالات کے علاوہ تراجم و تصانیف کی سیکڑوں جلدیں لکھ ڈالیں اور علم و ادب، افسانہ و قصص، تاریخ و سیاست، معیشت و معاشرت اور مذہب و ثقافت کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جس میں ان کی کوئی نہ کوئی کتاب نہ شائع ہوئی ہو۔ کچھ عجب نہیں کہ ان کی کتابوں کے صفحات کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جائے۔

حیرت ہوتی ہے کہ تنہا ایک شخص نے کتابوں کا اتنا بڑا انبار کس طرح جمع کر دیا۔ صحت کی طرف سے بے پروا تھے، طالب علمی کے زمانہ ہی سے پیری اور پھر سگرٹ نوشی کثرت سے کرتے تھے تمباکو کھاتے بھی کافی تھے۔ میں نے ایک مرتبہ کہا کہ اس سے تمھاری صحت کو نقصان پہنچے گا، کہنے لگے: "کتنی عمر کم ہو جائے گی"۔ میں نے کہا "دس سال" یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے "اچھی بات ہے دس سال دے دیے باقی زندگی تو لطف سے گذرے گی"۔ اخبار نویسی کے دور میں رات کو دیر تک جاگنے کی بھی عادت ہو گئی تھی، سنا ہے کہ پاکستان جانے کے بعد تراجم و تالیفات کا کام بڑھا تو شب بیداری میں بھی اضافہ ہوا، رات کے سناٹے میں لکھنے کا کام بہت ہوتا ہے لیکن یہ رت جگا زندگی کے لیے ساز گار نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کا ناگوار اثر ان کی صحت پر پڑا، پہلی بار قلب کا دورہ پڑا تو غذا میں احتیاط کرنے لگے۔ وزن بھی بہت کم کر لیا لیکن کم خوابی پر قابو نہ پا سکے، بالآخر مرض بڑھتا گیا، اور آخر اس بیماریٔ دل نے کام تمام کر دیا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے کہ اس کی رحمت و مغفرت پر انھیں بڑا بھروسہ تھا۔

(بشکریہ برہان "دہلی")